مصطفیٰ زیدی

موج مری صدف صدف

ماورا پبلشرز
۳- بہاولپور روڈ ، لاہور

اپنے مرحوم بھائی

مجتبیٰ زیدی

کے نام

تم کہاں رہتے ہو اے ہم سے بچھڑنے والو!
ہم تمہیں ڈھونڈنے جائیں تو ملو گے کہ نہیں
ماں کی ویران نگاہوں کی طرف دیکھو گے؟
بھائی آواز اگر دے تو سنو گے کہ نہیں

دشتِ غربت کے بھلے دن سے بھی جی ڈرتا ہے
کہ وہاں کوئی نہ مونس نہ سہارا ہو گا
ہم کہاں جشن میں شامل تھے جو کچھ سن نہ سکے!
تم نے ان زخموں میں کس کس کو پکارا ہو گا

ہم تو جس وقت بھی، جس دن بھی پریشان ہوئے
تم نے آکر ہمیں محفوظ کیا، راہ دکھائی
اور جب تم پہ بُرا وقت پڑا تب ہم لوگ
جانے کس گھر میں، کہاں سوئے ہوئے تھے بھائی

(۲)

ہم تری لاش کو کاندھا بھی نہ دینے آئے
ہم نے غربت میں تجھے زیرِ زمیں چھوڑ دیا
ہم نے اس زیست میں بس ایک نگیں پایا تھا
کسی تربت میں وہی ایک نگیں چھوڑ دیا

(ناممکن ...... وہ نوحہ جو کبھی مکمل نہیں ہو سکتا)

ترتیب

تلپھے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں

چکبست نے (جن کا حوالہ دینا کوئی ایسی معززبات نہیں) ایک شعر میں اپنے غم و غصّہ کا اظہار یوں کیا ہے ؎

ہوا مزاج کا عالم یہ سیرِ یورپ سے
کہ اپنے ملک کی آب و ہوا کو بھول گئے

ممکن ہے کوئی اس شعر پر شرمندہ ہوا ہو، اور کسی نے اس سے عبرت حاصل کی ہو۔ مجھے ان دونوں کی توفیق نہیں ہوئی۔ اپنے ملک کی آب و ہوا تو خدا کے فضل سے اتنی نرم و گرم ہے کہ اسے کون بھلا سکتا ہے لیکن سیرِ یورپ سے جو اضافی قدروں کی تھوڑی بہت سوجھ بوجھ پیدا ہو جاتی ہے۔ وہی لے ڈوبتی ہے اور اسی کے طفیل کوئی اکبر الہ آبادی کا ولین بن جاتا ہے اور کوئی چکبست کا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہم پچیس آدمیوں کا مختصر لیکن مختلف النوع قافلہ جب لندن پہنچا تو کسی کا کچھ ردِ عمل ہوا اور کسی کا کچھ۔ مثلاً ایک صاحب نے بی بی سی کے انٹرویو میں اپنا بیان دیتے ہوئے کہا کہ "جناب ہم تو محجوب ہیں جو یہاں آکر ہم کو یہ دیکھنا پڑ رہا ہے کہ بے نقاب "عورتیں" نامحرم" مردوں کے ساتھ شاہراہ عام پر گھومتی پھرتی ہیں"۔ اس بیان کا اگر اس لطیفے سے مقابلہ کیجیے کہ صاحب لندن میں جو بات مجھے سب سے زیادہ عجیب معلوم ہوئی وہ یہ کہ یہاں کا بچہ بچہ انگریزی بولتا ہے" تو لطیفہ ہیچ معلوم ہوگا۔

بس ایک ہم تھے اور ایک ارشاد بھائی جن کو بے نقاب عورتوں کا نامحرم مردوں کے ساتھ گھومنا معیوب نہیں معلوم ہوا اور اس پر دبی دبی زبان سے لندن میں یہ شعر ہوا تھا ؎

کچھ لوگ اک گلاس بیئر میں بہک گئے
ہم وہ ستم ظریف کہ وسکی چڑھی نہ رم

اس طرح کے بہت سے شعر، بہت سی غزلیں اور بہت سی نظمیں لکھنے کے مواقع آئے۔ بیشتر ایسے اشعار ہیں جو سینہ بہ سینہ چلتے ہیں اور کبھی نہیں چھپ سکتے اس لئے کہ لکھنے والے نے

چاہے کتنے ہی خلوص سے اور کتنے ہی غیر جذباتی طریقے سے کیوں نہ لکھا ہو، جس کسی کو ان اشعار میں اپنی صورت نظر آتی ہے وہ خفا ہوتا ہے آئینے کو سیاہ اور مزاح کو تحقیر سمجھتا ہے، کہ اندازِ دلبری یہی ہیں !

۱۵ر مئی ۱۹۵۶ء کو میں نے اپنا اگلا پچھلا اثاثہ جوڑ کر اور تمام ہندسوں کی تفریق کو پورا ہندسہ سمجھ کر، فورڈ کمپنی سے ایک چھوٹی سی دس ہارس پاور کی پرلیفکٹ خرید لی۔ چنانچہ اس مجموعے میں جو غزل یوں ہے کہ ؎

کوئی رفیق بہم ہی نہ ہو تو کیا کیجے
کبھی کبھی ترا غم ہی نہ ہو تو کیا کیجے

اس میں اس وقت یہ شعر بھی ہوا کرتا تھا ؎

زفائرکس پہ مرنے کو ہم کبھی مرتے ہیں
گرہ میں دام و درم ہی نہ ہو تو کیا کیجے

یہ کار خریدنے کے بعد جو منصوبہ تھا کہ یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کا سفر اسی پر ہوگا۔ وہ بالکل مکمل ہو گیا اور ارشاد بھائی اور میں اس منصوبہ کے فریقین طے پائے۔ جب اگست میں چلنے چلانے کا زمانہ آیا تو ایک اور رفیقِ کار فتح خان بندیال بھی آ ملے اور کارواں بنتا گیا فتح خان بندیال نے ہمراہ صرف بغداد تک سفر کیا اور وہاں سے پرلیفکٹ کو حقیر فقیر سمجھ کر بی اے او سی کے طیارے پر کراچی روانہ ہو گئے اور سفر کو ابتدا سے انتہا تک پہنچانے کا سہرا ارشاد بھائی کے اور ہمارے سر ہی رہا۔

اس سفر کی طویل حکایت کا یہ مقام نہیں۔ اس تمام پیش بندی کا بھی صرف یہ مقصد تھا کہ اس مجموعے کی اکثر نظمیں قیامِ انگلستان یا سفرِ یورپ کے زمانے کی ہیں اور ان سے ذہن کی ایک خاص (؟) مرتب کی جا سکتی ہے لیکن یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ ان لفظوں میں "پیامِ مشرق" کا جواب "پیامِ مغرب" اور "تو شب آفریدی، چراغ آفریدم" والا موڈ نہیں ہے بلکہ چند تاثرات ہیں، چند خاکے، آنسوؤں کی دھندلاہٹ بھی ہے اور مستقبل کا خواب بھی ہے۔ اگر کوئی ایک اکیلی نظم ان تمام باتوں کا خلاصہ ہے تو وہ "شہرِ آذر" ہے اور اسی اہمیت کے پیشِ نظر میں نے

اسی عنوان سے علیحدہ کتاب چھاپنے کا فیصلہ کیا تھا اور اسی لئے اس مجموعے میں یہ نظم دوبارہ شامل کی گئی ہے۔

میں نے جو تھوڑی بہت دنیا دیکھی ہے اور اپنوں اور غیروں کے ساتھ گذاری ہے۔ اس سے میرے لئے یہ نتیجہ اخذ کرنا آسان ہے کہ محض مشرق کی دہائی دے کر کوئی نہ کوئی نقاد اس مجموعے کو بغیر پڑھے بدنام کرا سکتا ہے۔ بلکہ ایک چھوٹے سے پیمانے پر ایسا ہوا بھی ہے۔ ایک صاحب نے جو کئی اخباروں، رسالوں کے مدیر اور شاعر، مضمون نگار وغیرہ وغیرہ ہیں۔ مجھے خط میں لکھا تھا کہ آپ نے شکست، فرار، انتقام والی نظم میں اپنے اسی زمین کے دوستوں کا جو مذاق اڑایا ہے وہ نہ آپ کو زیب دیتا ہے نہ آپ کے حق میں اچھا ہے۔ بہرحال "شریکِ حیات"، (یہ نظم شہرآذر میں شامل ہے) کی بات بھی چونکہ درمیان میں آ گئی ہے اس لئے آپ کو صرف مبارکباد دیتا ہوں"۔ میرے حق میں اچھا نہ ہونے والی جو دھمکی ہے اس کے تو نہ جانے کیا معنے ہیں لیکن اتفاق دیکھئے کہ "شریکِ حیات" عنوان کی نظم میں نے یورپ جانے سے چھ سال قبل لکھی تھی، اسی طرح اور بھی چند اصحاب نے میرے یورپ کے ردِ عمل ان نظموں میں ڈھونڈے ہیں جو کافی عرصہ پہلے کی ہیں۔ ایمانداری کی بات تو یہ تھی کہ میں ان تمام نظموں، غزلوں پر تاریخیں درج کر دیتا لیکن اس طرح ایک لطف سے محروم ہونے کی گنجائش نکل آتی۔

ہمارے سفر کا جغرافیہ یہ تھا۔ انگلستان۔ فرانس (دوور۔ کیلے۔ ایملین۔ پیرس۔ ریلنر)۔ بلجیم ہالینڈ۔ جرمنی (کولون۔ فرینکفرٹ۔ میونخ) سوئٹزرلینڈ۔ دوبارہ فرانس (جنوبی سمت۔ مانٹے کارلو)۔ اٹلی (میلان۔ جینو۔ فلورنس۔ روم۔ وینس)۔ آسٹریا۔ یوگوسلاویہ (ٹریسٹ۔ زغرب۔ بلگریڈ) یونان (ایتھنز۔ تھسولونیکا)۔ ترکی (استنبول۔ انقرہ) سیریا۔ لبنان (بیروت دمشق)۔ جارڈن۔ عراق۔ فارس (زیارتیں) پاکستان (کوئٹہ)۔

جب ہم انگلستان سے نکلے تھے اور اس دکھ اور درد کے ساتھ جیسا کہ اپنے وطن کو چھوڑتے وقت محسوس ہوتا ہے، جیسے دل کی کشتی اس گہرے نیلے پانی کے دھاروں پر ایک بار پڑ گئی تو نہ جانے کدھر نکل جائے ؎

نگر نگر کے خواب میں گم ہیں ڈوور کے ملاح
میں ان خوابوں کے مبہم سناٹے سے آگاہ
اونچی لہریں، بڑھتا دریا، نیچی شہر پناہ (ڈوور)

اس کے ساتھ ساتھ یہ امکانات بھی تھے ؎

شاید اس طوفان میں ساری بنیادیں ہل جائیں
یا مشرق اور مغرب کے ساحل اک دن مل جائیں

خدا کا شکر ہے کہ ڈوور سے چلنے اور کوئٹے پہنچنے والے لمحے کے درمیان "یورپ بعید" اور مشرق وسطیٰ بھی آ گئے اور دل کو یہ تسلی ہوئی کہ ہم اپنے ملک میں ہزار خراب سہی لیکن اکثر سے اچھے ہیں ورنہ اگر کہیں ہم بھی بی او اے سی کے طیارے سے سیدھے واپس پہنچ جاتے تو کسی رات بھی نیند نہ آتی۔

ہم نے دو سو سال انگریز کی غلامی کی۔ لیکن جو بات سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ ہم پر حکومت کرنے والا انگریز اور انگلستان میں رہنے والا انگریز دو مختلف قومیں ہیں۔ ایک میں نشہ تھا، غرور تھا، فراست و تدبر کے ساتھ دوسرے کو محکوم بنائے رکھنے کی سیاست تھی۔ دوسرے میں دیانت، بردباری، ضبط اور مکمل جمہوریت تھی۔ اسی تضاد کی طرف یہ اشارہ ہے۔ ؎

کس طرح یقیں آئے کہ اس ذہن نے اک روز
دانستہ روا رکھے تھے تخریب کے آداب؟
کس طرح یقیں آئے کہ ہوگی تجھے منظور!
توصیفِ شبِ ہجر و نوائے دلِ بیتاب؟
اے نزہتِ مہتاب!
(اے نزہتِ مہتاب!)

یہ تو ان کا اپنا تضاد تھا۔ دوسرا تضاد ان کا اور ہمارا ہے۔ اس کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ ان کے برعکس، نہ ہماری خوشی خوشی کی طرح ہوتی ہے اور نہ غم، غم کی طرح، ہم سب خدا کی سلطنتِ جبر و اختیار میں مضمحل اور سوختہ حال اور تبسمِ فردا سے بے نیاز بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں رسمِ دل کے مطابق نہیں، بلکہ لہر کی آغوش میں رہنے کے باوجود لہروں سے بچ

کر۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں اس کی رسم حلقۂ دار و رسن سے گزرے بغیر نہیں چل پاتی۔ یہ ساری باتیں مجھے پیپل کاسل کی ایک شام اور یورپ کی ہر شام نے سمجھائی ہیں۔

"شہرِ آذر" کے بعد جو نظم ان دو ثقافتوں کی مختلف طبیعتوں کا عکس پیش کرتی ہے وہ "فرار، شکست، انتقام وغیرہ" ہے۔ میں اس نظم کے بارے میں یہ سمجھتا ہوں کہ بیک وقت یہ میری سب سے زیادہ ذاتی اور سب سے زیادہ غیر ذاتی نظم ہے۔ اس نظم میں مشرق اور مغرب کا بُعد بھی ہے۔ وہ یکجائی بھی ہے جہاں سب ایک ہی حمام میں ننگے ہو جاتے ہیں۔ مہاتما جی سے سائرٹز علیہ السلام تک ؎

مشرق کے پنڈت، مغرب کے گرجا والے
صبح ہوئی اور سچائی کے پیچھے بھاگے
سچائی ایک قحبہ تھی جو رات کو تھک کر
سوئی ہوئی تھی شور سُنا تو خوف کے مارے
تھر تھر کانپی، روزِ عدالت سے گھبرائی
روپ بدل کر پیچھے نکلی آگے آگئے!
مشرق کے پنڈت مغرب کے گرجا والے

(۲)

(فرار، شکست، انتقام)

یوں تو ہر شخص کو اپنے ماں، باپ، بھائی، بہنوں سے محبّت ہوتی ہے۔ لیکن اکثر خاندانوں میں کوئی نہ کوئی ایک شخص ایسی ہمہ گیر شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ جو تمام خاندان کا مرکز بن جاتا ہے۔ میرے بڑے بھائی مجتبیٰ زیدی میرے لئے صرف بھائی نہیں تھے بلکہ ماں اور باپ بھی تھے اور کتنے ہی دوسرے لوگ بھی ان کے متعلق اسی طرح سوچتے تھے۔ اگست ۱۹۵۷ء میں جس طرح کا سفر میں نے کیا تھا اسی طرح کے سفر سے وہ بھی انگلستان سے واپس آرہے تھے۔ مشہد تک پہنچ چکے تھے۔ جب ان کی کار کا ایک بس سے حادثہ ہو گیا۔ جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ یہ سانحہ میرے اور بہت سے لوگوں کی زندگیوں میں جتنا انقلاب انگیز اور روح فرسا تھا اس کا اظہار میرے بس کی بات نہیں۔ یہ کتاب اسی مرحوم بھائی کے نام معنون ہے۔ جس کی موت کا یقین نہیں آتا۔ اور جس کے بعد اپنی زندگی بیکار، بے معنی اور موت سے بدتر معلوم ہوتی ہے۔

گذرنے والوں میں کتنے جگر فگار تھے آج
فقیرِ راہ ہیں ہم، ہم کو کیا نہیں معلوم
صبا چلی تو ہے اس بار جھولیاں بھر کے
کسی کو راس بھی آئے گی یا نہیں معلوم
ہمیں بھی راہ میں اک دن تمہارا خانہ بدوش
نظر تو آیا تھا لیکن پتہ نہیں معلوم
بہت سے وہ ہیں جو بارِ سفر اٹھا نہ سکے
بہت سے وہ ہیں جنہیں راستہ نہیں معلوم

اندیشہ ہائے دور و دراز

اب سے پہلے بھی اس محفلِ رقص میں گھنگروؤں کے چھناکے بکھرتے رہے
قبل اور وسط اور حال کے قافلے سب اسی راستے سے گذرتے رہے
مندروں میں کھنکتی رہیں گھنٹیاں مسجدوں کے منارے ابھرتے رہے

اب سے پہلے بھی آسودگی کیلئے آسماں کی طرف آنکھ اٹھتی رہی
اب سے پہلے بھی حسنِ سفر کیلئے کہکشاں کی طرف آنکھ اٹھتی رہی
اب سے پہلے بھی انسان کے نکتہ چیں اعتقادات کی بات کرتے رہے

خوبصورت سی اک ناؤ دے کر سخن گر نے لہروں کے چکر میں الجھا دیا
معتبر رہنماؤں نے دھوکے دیئے خضر صورت بزرگوں نے بہکا دیا
خضر صورت بزرگوں کی آنکھوں میں تقدیس کے سرخ ڈورے ابھرتے رہے

آدمی کے تراشے ہوئے وہم نے آدمی کے لئے خار و خس چن دیئے
قیصروں سے غلامی کا تمغہ ملا دیوتاؤں نے افلاس کے ہن دیئے
پاک پروردگارِ مہ و مہر کی رحمتوں سے اندھیرے نکھرتے رہے

چشمِ مشتاق کو رُخ کی تابانیاں دیکھنے کی سعادت نہیں مل سکی
شام گزرے بھی مدت ہوئی اور ابھی آئینے کو اجازت نہیں مل سکی
صبح بھی تجھ سے پوچھیں گے اے رودِ دل تیرے گیسو کہاں تک سنورتے رہے

مارگرٹ

محل کے در پہ کلیسا کے طاقِ کہنہ میں
کہاں کہاں نہ چراغاں ہوا دلِ بے تاب
پھر ایک بار کسی بے ستون کا پتھر
مزاجِ تیشہ کا پرساں ہوا دلِ بے تاب
وہی قدیم کہانی نئے سرے سے چلی
وہی روش وہی عنواں ہوا دلِ بے تاب
تمام رات بکنگھم میں دیپ جلتے رہے
تمام رات شہیداں ہوا دلِ بے تاب
جو لوریوں کے ترنم میں سج کے آتا تھا
وہ خواب خوابِ پریشاں ہوا دلِ بے تاب
کئی لباس تھے پر صرف چاک ہونے کو
ہم عاشقوں کا گریباں ہوا دلِ بے تاب

ابھی جب اپنی عنایات کا خیال آیا
سنا ہے حسن پشیماں ہوا دلِ بے تاب
نہ یہ کہ بات فقط ٹاؤنسنڈ پر گزری
کسی کا ہم پہ بھی احساں ہوا دلِ بے تاب

ایک عصرانہ

جانِ محفل ترا اندازِ سخن جو کچھ ہو
تیری افتاد، ترے دل کی جلن جو کچھ ہو
تجھ کو آتا ہو ستاروں سے کنایہ کرنا
تو نے سیکھا ہو خداؤں کو رعایا کرنا
لفظ کی اوٹ میں کھلتے ہوں معانی کیا کیا
بات بنتی ہو اشاروں کی زبانی کیا کیا

آج ٹوٹا یہ طلسمِ لب و سحرِ امکاں
جب تری جنبشِ ابرو سے نہ چٹکیں کلیاں
تو نے تسخیر و تعلق کے لئے کیا نہ کیا
اس نے اظہار تو کیا وہمِ تمنا نہ کیا
اے کہ تو شمعِ سرِ طور ہے کاشانوں میں
نام بھی اس نے نہ پوچھا ترا مہمانوں میں

فرار، شکست انتقام وغیرہ وغیرہ

(ہر شاعر اور ہر عاشق کے علاوہ سنجیدگی سے خود اپنی عبرت کیلئے)

حصۂ اول :-

اچھا ہوا کہ رسمِ مروت بھی اُٹھ گئی
اچھا ہوا کہ آنکھ کا پانی بھی ڈھل گیا
تاروں میں جس خلوص کے نکھرے تھے خد و خال
وہ دِن کی تیز دھوپ میں آیا تو جل گیا

اک لمحہ جاوداں نہ اگر ہو سکا تو کیا
ہم کو شکستِ حرفِ تمنا کا غم نہیں!
آئینِ سنگ باریٔ فطرت کا رنج ہے
شیشوں کے سوگوار مسیحا کا غم نہیں

اب یہ تو ہے کہ قصۂ فرہاد پہ ہمیں
وحشت نہ ہوگی ٹوٹ کے رونا نہ آئیگا

پروائے ننگ و نام رہے گی جو کل نہ تھی
دل کو دیارِ غیر میں کھونا نہ آئے گا

احساس تو رہے گا کہ ہر ایک بات پر
ہم ہی غلط ہیں سارا زمانہ غلط نہیں
سینہ فگار ہے تو ہمارا قصور ہے
آقائے دوجہاں کا نشانہ غلط نہیں

ہر "خیر خواہ" کو دلِ ناداں نے آج تک
"ناصح" کہا "حکیم" کہا "محتسب" کہا
ہر "باشعور" دوست پہ سو پھبتیاں کسیں
"زندی" کو "فہم" "خانہ خرابی" کو "طِب" کہا
ماضی کے قیس آج کے ہم دونوں سادہ لوح
اسٹیکل اور فرائڈ کے کردار عام ہیں
یکتائے روزگار نہیں ہم میں ایک بھی
ہم لوگ صرف اپنی نظر میں امام ہیں

سب کچھ گنوا کے آج فقط یہ پتہ چلا
آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے دھوئیے
دنیا میں مہ لقاؤں کی کوئی کمی نہیں
کس کس پہ جان دیجئے کس کس کو روئیے

ایک قطعہ اسی سلسلے میں

جسے چاہے اسے دے آمریت
متاعِ غم کی ناپیدی نہیں ہے
بہت ہے یوں تو اس کے میکدے میں
برائے مصطفےٰ زیدی نہیں ہے

حصہ دوم :-

(زبانِ یارِ من ----)

SELF —— PITY
ISN'T WITTY
IT JUST STINKS
WHILE MONOTONOUS RELATION
OF ONE'S SELF DEPRECIATION
MEANS ACCEPTANCE, IN THE END OF---
OIII'S WORD

حصّہ سوئم

کچھ عشق کی افتاد تھی کچھ حسن کی توصیف
پہلے تو ہر اک نظم میں اک ڈھنگ تھا اک طور
ہر شاعرِ امروز پہ لازم ہوئی جب فکر
ہم نے بھی کئی ایسے مسائل پہ کیا غور
اس طرزِ تفکر سے ہوا ذہن میں آغاز
شکووں کا اک انبار شکایات کا اک دور
اس قسم کے شکوے کہ جو جائیں تو کہاں جائیں
انسان تو انسان ہے لندن ہو کہ لاہور
اس قسم کے شکوے کہ جواں تھا ابھی زیدی
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

اس قسم کے شکوے کہ

یونان کی زمین نے ہذیان و کرب میں
اک اندھے دیوتا کو جنم کس لئے دیا؟
جو بادِ تند و دستِ صبا دیکھتا نہیں
انسان دیکھتا ہے خدا دیکھتا نہیں

مری زبان پہ تانبے کا ذائقہ کیوں ہے
مرا ستارہ کدھر جگمگا کے ڈوب گیا؟
نہ جانے سوزِ طبیعت نہیں کہ آہ نہیں
ردائے ابر کے پیچھے نگارِ ماہ نہیں
نہ جانے کیسی ہے اب ارضِ خاک کی صحت
دعا کریں نہ کریں، التجا کریں نہ کریں

مشرق کے پنڈت، مغرب کے گرجا والے
صبح ہوئی اور سچائی کے پیچھے بھاگے
"سچائی" اک قحبہ تھی جو رات کو تھک کر
سوئی ہوئی تھی شور سنا تو خوف کے مارے
تھر تھر کانپی، روزِ عدالت سے گھبرائی
روپ بدل کر پیچھے نکلی، آگے آگے
مشرق کے پنڈت، مغرب کے گرجا والے

اب تک ہمارے ساتھ رفیقانِ جستجو
کچھ موت، کچھ حیات کے ہمراہ آئے تھے
ہم ایسے بدنصیب کہ میخانہ دیکھنے
یاروں کے التفات کے ہمراہ آئے تھے
یوں ہم کہاں، شراب کہاں لیکن ایک شام
کچھ یار دوست ساتھ تھے کچھ ہم اداس تھے
اس کی نظر کے فیض سے غم اور بڑھ گیا
پہلے بھی تھے اُداس مگر کم اُداس تھے

اس اداس کمرے میں
رات کیسے گُزرے گی
نیند کیسے آئے گی

میری مضمحل ہمدم
آج میری پلکوں پر
تیری انگلیوں کا لوچ
سسکیاں سی بھرتا ہے
ٹیٹ گیلری کے بُت
کیو گارڈن کے پھول
ٹیمز کی سبک لہریں
خوں فگار ٹاور کے
وہم آزما کوچے
ایسٹ انڈ کی دنیا
فنچلے کے ریستوراں
ویسٹمنسٹر کے گیت
جیمز پارک میں تیرے
قُرب کی جواں دھڑکن
انتظار کے پودے
اعتبار کی شبنم!

میری مضمحل ہمدم
تیرا غم نہ اپنا غم
اس اداس کمرے میں
رات کیسے گزرے گی
نیند کیسے آئے گی

دوستو اِس جشنِ عالم کے سنہرے دور میں
انفرادی آنسوؤں کی آگ کا غم مت کرو
ایک سورج بادلوں میں کھو گیا تو کیا ہوا
کھڑکیاں کھولو، گھروں کی روشنی کم مت کرو
یہ لہو گندا لہو تھا اس سڑک کو چھوڑ دو
رفتگاں کی ٹوٹتی کڑیوں کا ماتم مت کرو

اندھیرے کی سنسان لہروں کے پیچھے
ذرا سا جزیرہ
ذرا سے جزیرے میں دو چار سائے
دھندلکے کی صورت
اندھیرے کی مورت
جو حسرت کو سمجھے نہ خوابوں میں جائے
دھوئیں اور مٹی میں مکڑی کے جالے
یہ رُوحیں، یہ گھر، یہ محل، یہ شوالے
کوئی اپنے کاندھوں پہ کیا کچھ سنبھالے

اس قسم کی باتیں کر:-

یارو خدا کا خوف کرو، خوش رہا کرو
دشمن کی دوستی سے ڈرو، خوش رہا کرو
یہ بھی نہیں ضرور کہ بے حد ہنسو مگر
رو رو کے میکدہ نہ بھرو، خوش رہا کرو
مرتے ہو، دوسروں کو تو جانیں عزیز ہیں
آشفتہ حالو، خفتہ سرو، خوش رہا کرو

وہ آگہی کہ زلف نہ زنجیر دیکھئے
وہ معرفت کے کون و مکاں گردِ رہگذار
وہ منزلِ گداز کہ حرفِ سکوت بار
وہ روشنی کہ دوست کی تصویر دیکھئے

ماہیت

میں سوچتا تھا کہ بڑھتے ہوئے اندھیروں میں
افق کی موج پہ اُبھرا ہوا ہلال ہو تم
تصورات میں تم نے کنول جلائے ہیں
وفا کا روپ ہو احساس کا جمال ہو تم
کسی کا خواب میں نکھرا ہوا تبسم ہو
کسی کا پیار سے آیا ہوا خیال ہو تم
مگر یہ آج زمانے نے کر دیا ثابت
معاشیات کا سیدھا سا اک سوال ہو تم

آسماں زرد تھا

اے کلی تجھ کو ہمارا بھی خیال آ ہی گیا
ہم تو مایوس ہوئے بیٹھے تھے صحراؤں میں
اب ترا روپ بھی دھندلا سا چلا تھا دل میں
تو بھی اک یاد سی تھی جملہ حسیناؤں میں
تہ بہ تہ گرد سے آلود تھا دن کا دامن
رات کا نام نہ آتا تھا تمناؤں میں

رقصِ شبنم کی پرستار نگاہوں کے لئے
دھوپ کے ابر تھے خورشید کی لو چھائیں تھیں
آسماں زرد تھا جیسے کوئی یرقاں کا مریض
جس کے تکیے کے لئے ریت کی دستاریں تھیں
دل بھرا رہتا تھا جلتے ہوئے چھالے کی طرح
روح کے واسطے دیواریں ہی دیواریں تھیں

کوئی آواز نہ آتی تھی بہ جُز صوتِ مہیب
کوئی نغمہ نہ تھا چیلوں کے ترنم کے سوا
سارا انداز تھا پھیلے ہوئے دریاؤں کا
ریگِ صحرا کے سمندر میں تلاطم کے سوا
خشک پتوں کا نمک ریت کے ذروں کی مٹھاس
ہونٹ سب ذائقے رکھتے تھے ترنم کے سوا

کب تک اس دل کی لگن راس نہ آتی آخر
مسکراتا ہوا گردوں پہ ہلال آ ہی گیا
اپنے دیوانوں کو سینے سے لگانے کے لئے
اک غزل پیکر و افسانہ جمال آ ہی گیا
اے فلک تو نے ہمیں خاک سے آخر کو چنا
اے کلی تجھ کو ہمارا بھی خیال آ ہی گیا

پولونئیس

(شکسپیر ہیملٹ کا ایک ویلن)

میں اس افسانے کا کردار ہوں جس کا ہیرو
عرش پر چلتا ہے تاروں پہ قدم رکھتا ہے
اس کی تحویل میں یونان کے بت رہتے ہیں
وہ کنیزوں میں نگاران عجم رکھتا ہے
تخت و طاؤس و طرب اور غزال و نکہت
دیر و فردوس و صنادید و حرم رکھتا ہے

وہ اس افسانے کا ہیرو ہے جس افسانے میں
میں جب آتا ہوں تو بے جیب و قبا آتا ہوں
رنگ اور نور کے سیلاب میں میری صورت
آئینہ دیکھنے لگتا ہے تو شرماتا ہوں
دن گذرتا ہے نئے زخموں کو گنتے گنتے
رات آتی ہے تو ہر زخم کو سہلاتا ہوں

وہ تو بس ایک ہے اور مجھ سے گریباں بیزار
اتنی تعداد میں ہیں جیسے کہیں مور و مگس
ہیملٹ اس کے لبادے کے تلے چلتا ہے
اور مرے دل میں دھڑکتا ہے سوالوں کا جرس

آخر اک عمر کی محنت تیرے کس کام آئی
اس بڑھاپے کی سعادت ترے کس کام آئی
تیری بچی کو بہا لے گئی چھوٹی سی ندی
سینکڑوں سال کی حکمت ترے کس کام آئی

میں اس افسانے کا کردار ہوں جس کے کردار
اک ذرا دھوپ میں نکلیں تو پگھل کر رہ جائیں
خواب اور کہر کی آغوش میں رہنے والے
وقت کی آنچ میں آجائیں تو جل کر رہ جائیں
ہم کسی اور شب و روز سے مانوس نہیں!
اپنی اقلیم سے نکلیں تو نکل کر رہ جائیں

اسی خطرے سے نہ ماضی کی طرف آنکھ اٹھی
مڑ کے دیکھیں گے تو بن جائیں گے ہم سنگِ نمک
نہ کوئی غم، غمِ تاباں نہ مسرت بے لوث
اپنے امروز پہ تنقید نہ فردا پہ کسک
یہ چمکتی ہوئی باتیں یہ دمکتا ہوا ذہن
محض غازے کی عنایات فقط نوک پلک

صرف میرے دلِ شوریدۂ ناشستہ کو
کچھ نہ کچھ بننے کی حسرت تھی مگر بن نہ سکا
ایک شعلے کو بھی حاصل نہ ہوا رقصِ دوام
ایک آنسو بھی مقدر سے گہر بن نہ سکا
میں نے ہر چند ہواؤں میں بچھائے شہتیر
کوئی چوکھٹ، کوئی گوشہ، کوئی گھر بن نہ سکا

جس نے دیکھی مری پرواز تمسخر سمجھا!
اپنے بھی مجھ پہ ہنسے خیر سے بیگانے بھی
میری اس بے پروبالی کا تماشہ کرنے
اہلِ ادراک بھی آجاتے تھے، دیوانے بھی
اس کے یونان کے بت دیکھ کے سب بھول گئے
انہی اطراف میں ہیں میرے صنم خانے بھی

کتنے ہنگامے ہیں اس شہر میں سب جانتے ہیں
کتنے ہنگامے ہیں اس قصر میں کس کو معلوم
اس کے دربار کے پالے ہوئے بدشکل غلام
اس کی بے نام حسیناؤں کا حسن محروم
اس کی راہوں میں سلگتے ہوئے عنبر کا دھواں
اس کی خدمت میں مذاہب کے طلسمانہ رسوم

لوگ سائے کی طرح چلتے ہیں کھو جاتے ہیں
قمقمے جلتے ہیں دوکان سجی رہتی ہے
برف جم جاتی ہے ہر راہ پہ لیکن جس میں
میری بچی کی لحد ہے وہ ندی بہتی ہے

اس کے نغموں میں جو آہنگ ہے اسکی بابت
میں نہیں کہتا مری نوحہ گری کہتی ہے

میں وہ کردار ہوں جس کو غمِ دل کے باوصف
لوگ کہتے ہیں کہ بے حس ہے، خراباتی ہے
سانس چلتی ہے تو بے لذتِ رفتارِ خرام
موت آتی ہے تو بے رختِ سفر آتی ہے
میرا جو کام ہے وہ نقص ہے اور نقصِ ضعیف
اس کی جو بات ہے وہ وصف ہے اور ذاتی ہے

میری سازش پہ تو راتوں نے گواہی دی ہے
اس کی سازش کو نسیمِ سحری سے پوچھو
کون دیوانہ تھا اور کون نہایت ہشیار
پوچھنے والوں کی افسانہ گری سے پوچھو
کون سے جرم میں برباد ہوا روزنکرانٹز!
میرے ہیرو کی فراستِ نظری سے پوچھو

روزنکرانٹز۔ ہیملٹ کا دوست جو ہیملٹ کے ایما سے قتل ہوا

آج کی رات پھر اسٹیج پہ رونق ہوگی
"اولڈوِک" شہرِ طلسمات نظر آئے گا
دیکھنے والوں کو ہر سازشِ خوں کے پیچھے
میرا فتراک، مراہات نظر آئے گا

اور میں رسم و روایات کی ضد کے باوصف
ایک ہی جست کو سیماب کی سیرت دے کر
اپنی افسانوی ہیئت کو بدل ڈالوں گا
جب مری روح برافگندہ نقاب آئیگی
لوگ گھبرا کے چلے جائیں گے اور میں چپ چاپ
ان نئے زخموں کو ویرانے میں سہلالوں گا

اولڈوک۔ انگلستان کا قومی شیکسپیرین تھیٹر

جدائی

روح کا ایک عمرانی تجربہ

نگارِ شامِ غم میں تجھ سے رخصت ہونے آیا ہوں
گلے مل لے کہ یوں ملنے کی نوبت پھر نہ آئے گی
سرِ راہے جو ہم دونوں کہیں مل بھی گئے تو کیا
یہ لمحے پھر نہ لوٹیں گے یہ ساعت پھر نہ آئے گی
کہ میں اب صرف ان گذرے ہوئے لمحوں کا سایہ ہوں

اسی بازار میں، بارہ برس ہونے کو آئے ہیں
کہ میں نے فاسٹس کی طرح اپنی روح بیچی تھی !
مسرت کی مسلسل گردشِ یکساں سے اکتا کر
تجھے حاصل کیا تھا اور ہر صورت بھلا دی تھی
پرانے ساز و ساماں اب مجھے رونے کو آئے ہیں

غضب کی تیرگی ہے راستہ دیکھا نہیں جاتا
ہوا کے شور میں دریا کی موجیں بڑھتی جاتی ہیں
زمیں سے اکھڑے جاتے ہیں درختوں کے قدم پیہم
چٹانیں روپ بدلے زیرِ لب کچھ پڑھتی جاتی ہیں
اب اپنی انگلیوں کا فاصلہ دیکھا نہیں جاتا
جرس کی نغمگی آوازِ ماتم ہوتی جاتی ہے
وہی معمول کے بت ہیں، وہی لمحوں کی ویرانی
ذرا سی دیر میں یہ دھڑکنیں بھی ڈوب جائیں گی
مری آنکھوں تک آ پہنچا ہے اب بہتا ہوا پانی
تری آواز —— مدھم —— اور مدھم ہوتی جاتی ہے

ایک سہرا

یارو شہیدِ رسمِ جفا ہم ہوئے کہ تم
اپنی سلامتی سے خفا ہم ہوئے کہ تم

ہم پر ہنسے گا جو بھی سنے گا یہ واردات
رسوا اسیرِ سموم و صبا ہم ہوئے کہ تم

اس کے حریمِ عارض و لب کے سکوت میں
ٹوٹے ہوئے دلوں کی صدا ہم ہوئے کہ تم

مانا کہ وہ ہمارے مقدر سے دور ہے
اس کیلئے دعا ہی دعا ہم ہوئے کہ تم

مانا کہ ہم پہ اس کی محبّت حرام ہے
چپ چاپ کشتگانِ وفا ہم ہوئے کہ تم

ہم اس ہوا کو چوم رہے ہیں جہاں وہ تھی
بیعت کنانِ دستِ صبا ہم ہوئے کہ تم

مشرق کے ہر رواج کی قربان گاہ پر
ہمراہیانِ کُل شُہدا ہم ہوئے کہ تم

ہے اُسکے چشم و رُخ کی ضیا غیر کیلئے
ہاں اسکے چشم و رُخ کی حیا ہم ہوئے کہ تم

ان انکھڑیوں میں شرم کے ڈورے کہاں سے آئے
ان انگلیوں پہ رنگِ حنا ہم ہوئے کہ تم

نظروں سے دور جس کو بسانی ہیں بستیاں
اس کے غریبِ شہرِ سبا ہم ہوئے کہ تم

لکھا ہوا ہے سارے ستاروں نے جسکا نام
اس کہکشاں پہ آبلہ پا ہم ہوئے کہ تم

جس کی خموشیوں میں حکایت کا لوچ تھا
اس کی حکایتوں کی بنا ہم ہوئے کہ تم

اس ایک دن میں کتنی ہی صدیاں گذر گئیں
اس ایک پل میں اپنی قضا ہم ہوئے کہ تم

اس عقل و فہم و عمر و فراست کے باوجود
ذہنِ رقیب و دستِ گدا ہم ہوئے کہ تم

وفا کیسی

آج وہ آخری تصویر جلادی ہم نے
جس سے اس شہر کے پھولوں کی مہک آتی تھی
جس سے بے نور خیالوں پہ چمک آتی تھی

کعبۂ رحمتِ اصنام تھا جو مدت سے
آج اس قصر کی زنجیر ہلا دی ہم نے
آگ، کاغذ کے چمکتے ہوئے سینے پہ بڑھی
خواب کی لہر میں بہتے ہوئے آئے ساحل
مسکراتے ہوئے ہونٹوں کا سلگتا ہوا کرب
سرسراتے ہوئے لمحوں کے دھڑکتے ہوئے دل
جگمگاتے ہوئے آویزوں کی مبہم فریاد
دشتِ غربت میں کسی حجلہ نشیں کا محمل

ایک دن روح کا ہر تار صدا دیتا تھا
کاش ہم بِک کے بھی اس جنسِ گراں کو پالیں
خود بھی کھو جائیں پر اس رمزِ نہاں کو پالیں
عقل اس حور کے چہرے کی لکیروں کو اگر
آمٹاتی تھی تو دل اور بنا دیتا تھا

اور اب یاد کے اس آخری پیکر کا طلسم
قصۂ رفتہ بنا زیست کی ماتوں سے ہوا
دور اک کھیت پہ بادل کا ذرا سا ٹکڑا
دھوپ کا ڈھیر ہوا دھوپ کے ہاتھوں سے ہوا
اس کا پیار اس کا بدن اس کا مہکتا ہوا روپ
آگ کی نذر ہوا اور انہی باتوں سے ہوا

گواہی

(۱)

خدا کی قسم
جو کہوں گا فقط سچ کہوں گا
کٹہرے کے پیچھے یہ انسان دراصل اک بھیڑیا ہے
بہت ہم نے اس کو سمجھایا، حقیقت کا رستہ دکھایا
ہر اک رنگ سے راستی پر بلایا
مگر یہ نہ آیا
یہاں تک کہ اک روز جب رات دن سے گلے مل
رہی تھی
(ہوا چل رہی تھی، کلی کھل رہی تھی)
میں اک چیخ سن کر کنوئیں پر جو پہنچا تو دیکھا
کہ یہ بھیڑیا ایک کمسن کے ساتھ اپنے آباؤ اجداد کی
آبرو کا لہو کر رہا ہے

(۲)

خدا کی قسم
جو کہوں گا فقط سچ کہوں گا
کٹہرے کے پیچھے یہ انسان دراصل اک دیوتا ہے
جو نیلی گپھاؤں سے اودے افق سے، ہمارے لئے رہنما
بن کے آیا
ہمیں اس نے چلنا اُبھرنا، بھٹک کر سنبھلنا سکھایا
مگر اس کے ہمسائے کی آمرانہ رعونت کو یہ سب
نہ بھایا
اور اک شام جب یہ مرے ساتھ اک کھیت میں چل
رہا تھا
یہ ہمسایہ اپنے کئی نوکروں اور غلاموں کو ہمراہ لایا
زد و کوب کی، ایک جھوٹا مقدمہ بنایا
قیامت تو یہ ہے کہ مے ایک نے پی ہے اور دوسرا ہاؤ ہو
کر رہا ہے!

دلِ رُسوا

وہی اک ہمدمِ دیرینہ رہا اپنا رفیق
جس کو ہم سوختہ تن، آبلہ پا کہتے تھے
جس کو اغیار سے حاصل ہوئی فقروں کی صلیب

شہر کے کتنے ہی کوچوں سے اٹھا اسکا جلوس
کتنے اخباروں نے تصویر اتاری اس کی
اس کے درشن سے بنا کوئی رشی کوئی ادیب

اگلے وقتوں سے یہی رسم چلی آتی ہے
ہم نے چاہا تھا کہ دنیا کا مقدر بن جائے
خود ہمیں ہو گئے برباد تو یہ اپنے نصیب

چیرنگ کراس

کوئی تم سے پوچھے ——
ستاروں کی رونق، چراغوں کی قربت، شبستاں کے اسرار
کافی نہیں تھے
جو تم نے کسی طاقِ دل سے لرزتی ہوئی موم بتی کی لو
بھی چرا لی ؟

کوئی ہم کو دیکھے —
سرِ رہگذر ایسے بیٹھے ہیں جیسے
کسی نے ذرا بھی جو پوچھا تو اس سے بگڑ کر کہیں گے
یہ دیر و حرم تو نہیں، کعبہ و آستاں تو نہیں ہے
خدا کی زمیں ہے، رہِ عام ہے کوچۂ یارِ نامہرباں تو
نہیں ہے

سینے ٹوریم

تری نگاہ کے سہمے ہوئے اجالے پر
مہیب رات کی پرچھائیاں لپکتی ہیں
ذرا سی بات میں نغمہ الجھ بھی سکتا ہے
ذرا سی دیر میں کلیاں بکھر بھی سکتی ہیں

یہ آنسوؤں کا تسلسل یہ کانپتے ہوئے ہونٹ
ترس رہی ہے کھلی رُت تری ہنسی کیلئے
یہ ہات جن کو بناتی تھیں دیپ مالائیں
دعائیں محور ہے میری زندگی کے لئے

اُمید و بیم کے عالم میں بھول کر بھی کبھی
کسی طرف سے نئی روشنی نہیں لپکی!
نہ جانے کب سے ترے رات دن ہیں فرق نہیں
نہ جانے کتنے دنوں سے پلک نہیں جھپکی

مگر اداس نہ ہو میری بدنصیب بہن
یہ نغمہ ساز سے ہٹ کر بکھر نہیں سکتا
ازل سے میں دلِ سیماب وار رکھتا ہوں
میں اسپتال کے بستر پہ مر نہیں سکتا

اے دل اے دل

اے دل اے دل رقص سے آگے کوئی کسی کا میت نہیں ہے
تیری لٹی ہاری آنکھوں میں چیخیں ہیں سنگیت نہیں ہے
کون بھلا سنیاسی بن کر تجھ سے گذرا اوقات کرے گا

ان پر ہوگا تیرا اثر کیا جو اگنی کو جل کہتے ہیں
الٹا تو بدنام ہے پاپی سب تجھ کو پاگل کہتے ہیں
تو کب تک سنسار سے غافل، اپنے من سے بات کرے گا

اپنے وقت سے پہلے اکثر بجھ جاتے ہیں جلتے دیپک
تو لیکن اے سب سے نرالے اس دھرتی پر آخر کب تک
زخموں سے ہولی کھیلے گا، اشکوں سے برسات کرے گا

بھڑکے بھڑکے تیری جوالا، سُلگے سُلگے تیرا ساون
بمباروں کی گھوم گرج میں کون سنے گا دل کی دھڑکن
اِسپٹنک کے دور میں کون سا کافر ہے جو نعت کرے گا

احسان فراموش

جب منڈیروں پہ چاند کے ہمراہ
بجھتی جاتی تھیں آخری شمعیں
کیا ترے واسطے نہیں ترسا، اس کا مجبور مضمحل چہرا!
کیا ترے واسطے نہیں جاگیں
اس کی بیمار رحمدل آنکھیں

کیا تجھے یہ خیال ہے کہ اسے
اپنے لٹنے کا کوئی رنج نہیں
اس نے دیکھی ہے دن کی خوں خواری آج گذری ہے شب کی عیاری
پھر بھی تیری طرح وہ بے چاری
ساری دنیا سے شکوہ سنج نہیں

زندہ باد اے انائے جذبۂ ضبط

مرحبا اے شکوہِ خدامی

اسکی قربت سے تجھ کو پھول ملے زندگی کے نئے اصول ملے

تیری الفت سے کیا ملا اس کو

زحمتیں ، اضطراب ، بدنامی

ایک کردار

خیال و خواب کی دنیا کے دل شکستہ دوست
تری حیات مری زندگی کا خاکہ ہے
غمِ نگار و غمِ کائنات کے ہاتوں
ترے لبوں پہ خموشی ہے، مجھ کو سکتہ ہے

مری وفا بھی ہے زخمی تری وفا کی طرح
یہ دل مگر وہی اک تابناک شعلہ ہے
ترا مزار ہے اینٹوں کا ایک نقشِ بلند
مرا مزار مرا دل ہے میرا چہرہ ہے

جو زہر پی نہ سکا تو حیات سے ڈر کے
وہ زہراب بھی بدستور پی رہا ہوں میں
شدید کرب میں تو نے تو خودکشی کر لی
شدید تر غمِ ہستی میں جی رہا ہوں میں (روشنی)

ایک علامت

(سعادت حسن منٹو کی وفات پر)

گھاس سے بچ کے چلو ریت کو گلزار کہو
نرم کلیوں پہ چڑھا دو غمِ دوراں کے غلاف
خود کو دل تھام کے مُرغانِ گرفتار کہو
رات کو اس کے تبسم سے لپٹ کر سو جائے
صُبح اٹھو تو اسے شاہدِ بازار کہو
ذہن کیا چیز ہے جذبے کی حقیقت کیا ہے
فرش پر بیٹھ کے تبلیغ کے اشعار کہو"

اسی رفتار سے چلتا ہے جہانِ گذراں
انہی قدموں پہ زمانے کے قدم اٹھتے ہیں
کوئی عینک سے دکھاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں
کوئی کاندھوں پہ اٹھاتا ہے تو ہم اٹھتے ہیں

ایک رقاصۂ طناز کی محفل ہے جہاں
کبھی آتے ہیں بھتیجے کبھی غم اٹھتے ہیں

کبھی اِک گوشۂ تاریک کے ویرانے میں
کسی جگنو کے چمکنے پہ فغاں ہوتی ہے
کبھی اس مرحمتِ خاص کا اندازہ نہیں
کبھی دو بوند چھلکنے پہ فغاں ہوتی ہے
کبھی منزل کے تصور سے جگر جلتے ھیں
کبھی صحرا میں بھٹکنے پہ فغاں ہوتی ہے

ہم نے اس جوہر کو سینوں میں دبا رکھا ہے
ہم اسی جوہر کے خطرے سے پریشان بھی ہیں
کون سمجھے گا کہ اس سطح خوش آواز کے بعد
اسی ٹھہرے ہوئے تالاب میں طوفان بھی ہیں
بھائی کی آنکھ کے کانٹے پہ نظر ہے سب کی
دیوتا بھی ہیں اسی بزم میں انسان بھی ہیں

خطِ سرطان سے آتی ہے ملرؔ کی آواز
اور امریکہ کے بازار میں کھو جاتی ہے
جائس کی فکر نے تعمیر کیا ہے جس کو
وہ زمیں حسرتِ معمار میں کھو جاتی ہے
کبھی منٹو کا قلم بن کے دمکتی ہے حیات
کبھی سرمائے کی تلوار میں کھو جاتی ہے

ہر پیمبر پہ ہنسا ہے یہ زمانہ لیکن
ہر پیمبر نے جھکائی ہے زمانے کی جبیں
اپنے ہمعصر سے خائف نہ ہو اے وقت کی آنچ
اسکی مٹی میں ستاروں کا دھواں ہے کہ نہیں
اسی مٹی سے دمکتی ہے یہ دھرتی ورنہ
"دُور دیک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا وچہ دیں"

جسم کے داغ چھپانا تو کوئی بات نہیں
روح کے زخم سلگتے ہیں پسِ پردۂ دل

سر چھپا لیتے ہو تم ریت میں جب کے آگے
اسی طوفان میں گھر جاتے ہیں لاکھوں ساحل
یل راہی جسے احساس نہ حسرت نہ طلب
ـ سفر جس میں نہ منزل نہ سراغِ منزل

بی حساس سبک ناک سے رومال ہٹاؤ
ماد میں محض تعفن ہی نہیں، خیز بھی ہے
وق درکار ہے قطرے کو گہر کرنے میں
: میں تاب پر اسرار بھی ہے تیز بھی ہے
ہ تو ہے وجۂ دل آزاری و آہنگ و ستیز
رنہ یہ طبع خوش اخلاق و کم آمیز بھی ہے

ہر کی تیرہ و تاریک گزرگاہوں میں
داستاں ہو گی تو منٹو کا قلم لکھے گا
زیست قانون و فرامینِ قفس کے آگے
بے زباں ہو گی تو منٹو کا قلم لکھے گا

اس شفاخانۂ اخلاق میں نشتر کے قریب
رگِ جاں ہو گی تو منٹو کا قلم لکھے گا

گوپی ناتھ اور ظفر شاہ کے جیسے کردار
کتنی گمنامی میں جی لیتے ہیں مر جاتے ہیں
کس نے ان آنکھوں میں وہ خواب بکتے دیکھے
جو اس انسانوں کے جنگل میں بکھر جاتے ہیں
کس کا آئینہ ہے موذیل کی اس روح کا عکس
جس میں مریم کے حسیں نقش نکھر جاتے ہیں

اے نئے عصر کی رگ رگ کو سمجھنے والے
فہم و ادراک بڑی ہیں تو بڑی تیری ہے
چند لمحوں کی خدائی ہے روایات کے ساتھ
فن کے آدرش کی روحِ ابدی تیری ہے
موت یہ صرف سعادت کی ہے منٹو کی نہیں
یہ شب و روز ترے ہیں یہ صدی تیری ہے

تو دوست کسی کا بھی ---

کتنے آئے، کتنے گئے ہم آس لگائے بیٹھے ہیں
پلکوں پر انگارے روکے، دیپ جلائے بیٹھے ہیں
کوئی ہماری بات سنو ہم صبح سے آئے بیٹھے ہیں

صبح کی بے فکری دے کر شاموں کی ہر اک صحبت دے کر
لوگ تو دو کوڑی بھی نہ دیں پر ہم نے بڑی قیمت دے کر
درد خریدا تھا سو اب اس کو دل سے لگائے بیٹھے ہیں

اٹھیے یوں گھٹتے رہنے سے سر کو ہوتا ہے سودا !
وہ ہرجائی آپ کا جب نہ ہوا تو غیر کا کیا ہو گا ؟
زیدی صاحب آپ یہ کس کا سوگ منائے بیٹھے ہیں

منزلیں، فاصلے

حافظے کی مدد سے چلو، ساتھیو
دور تک بکھر ہی بکھر ہے، راستے
راہ گیروں کے قدموں سے لپٹے ہوئے
اونگھتی سرحدوں کی طرف کھو گئے

ایک بے نام خطرے سے سہمے ہوئے
رنگ و رم کے لپکتے قدم تھم گئے
اور دریچوں سے بڑھتی ہوئی روشنی
برف و باراں کی یلغار میں کھو گئی
وقت عفریت کی رہ گزر بن گیا
شہر کا شہر اجڑا کھنڈر بن گیا

اس کراں تا کراں گونجتی رات میں
اس بپھرتے ہوئے بحرِ ظلمات میں

کون سُنتا خداؤں کی سرگوشیاں
کون بنتا نئی صبح کا پاسباں؟

سرنگوں تھے مہ و انجم و کہکشاں
سخت تھی یہ زمیں، دور تھا آسماں
جبر کے بازوؤں میں تڑپتی رہی!
اک کنوارے تبسم کی دوشیزگی
مجھ سے لہجے کی دھیمی کسک چھن گئی
میرا فن، میرے فن کی دمک چھن گئی
دل کی بے خوف للکار تک چھن گئی

حافظے کی مدد سے چلو ساتھیو
آؤ روشن کریں یاد کی انجمن
آؤ ڈھونڈیں وہ رسمِ جنوں، وہ چلن
دل کی آوارگی، ذہن کا بانکپن
اپنی شبنم سے نکھری ہوئی کھیتیاں

اپنے اُودے پہاڑوں کی پہلی کرن
اک نہ بھولے ہوئے خواب کی سرخوشی
اک نہ سمجھے ہوئے دیوتا کی لگن

اک نہ دیکھے ہوئے روپ کی کہکشاں
اک نہ اجڑے ہوئے شہر کی داستاں
اک نہ بکھرے ہوئے پھول کی نرمیاں
سحر و دام و طلسمات کے کارواں
جیسے موصل کی رنگین شہزادیاں
جیسے پہلی محبت کی بے تابیاں

کل جو گھر جل گئے تھے اسی راکھ سے
آؤ تعمیرِ دربار و ایواں کریں
آنسوؤں سے بہت سے دیئے بجھ چکے
آؤ اب آنسوؤں سے چراغاں کریں

دُوری

اے بہار تجھ کو اس کی کیا خبر
اے نگار تجھکو کیا پتا
دل کے فاصلے کبھی نہ مٹ سکے
انتہائے قرب نے بھی کیا
سب کی اپنی اپنی شخصیت الگ
سب کا اپنا اپنا زاویا
وہ بھی پھول تھے جو ہار بن گئے
وہ بھی پھول تھا جو جل گیا

ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

صنم خانے

سچ یہ ہے کہ وہ غم بھی رہا شاملِ امروز
جس غم میں نہ تخلیق نہ تعمیر نہ پرواز
جو گنبدِ آفاق کی ہمراز رہی تھی
دیوار سے ٹکرا کے پلٹ آئی وہ آواز
اب سنگِ سُبک مایۂ زنداں بھی نہیں ہیں
آئینۂ زلف و لب و مژگاں تھے جو الفاظ
جس طبع کے دامن میں تھے اٹھتے ہوئے خورشید
وہ ڈوبتے مہتاب کی کرنوں سے بھی نادم

اے نزہتِ مہتاب!

امروز کہ سڑکوں کے چراغاں میں کٹا تھا
امروز کہ تھا رنگِ رُخ و نور کا سیلاب
کچھ اور بھی تھا رنگِ رُخ و نور سے آگے
جلتا ہوا آہنگ سُلگتا ہوا مضراب

صدیوں کے تمدن سے دمکتی ہوئی دیوار
قرنوں کے احادیث سے نکھری ہوئی محراب
اک دل جو روایات کی ہر وضع کا مرکز
اک ذہن جو تحریکِ سماوات میں سیماب

کس طرح یقیں آئے کہ اس ذہن نے اک روز
دانستہ روا رکھے تھے تخریب کے آداب؟
کس طرح یقین آئے کہ میں اپنی خوشی میں
تحقیر سے دہراؤں گا فریاد کے القاب؟
کس طرح یقیں آئے کہ ہوگی تجھے منظور
توصیفِ شبِ ہجر و نوائے دلِ بے تاب
اے نزہتِ مہتاب!

(لندن)

اپسراؤں کا گیت

(ایک ریویو)

ریویو سطحی اور وقتی دلچسپی کے لئے پیش کئے جانے والے طربیے کو کہتے ہیں۔ اس طربیے کے پیچھے کبھی کبھی ایک حزن اور ایک آس نظر آسکتی ہے۔ جیسا کہ اس گیت میں ہے۔ یہ گیت لندن کے قدیم "ونڈمل تھیٹر" کے ایک ریویو کا تاثر ہے۔

(۱)

آج کی رات بھی کٹ گئی
جھومتی مسکراتی ہوئی
اب کی برسات بھی کٹ گئی

زخم دھونے کی فرصت ملے
کاش وہ فصل بھی آسکے
جس میں رونے کی فرصت ملے

(۲)

ہم نے جو کچھ کہا، ہو گیا
وقت قدموں سے لپٹا رہا
فاصلہ راہ میں سو گیا

رنگ و رم سے سبھی الجھے کوئی
کوئی پتھر، کوئی خارِ غم
کاش ہم سے بھی الجھے کوئی

(۳)

ہم کہ خوابوں کی شہزادیاں
ہم کہ نغموں کی روحِ رواں
ہم کہ پندار کی دیویاں

کاش دنیا خجل دیکھ لے
دیویوں کی قبا کے اُدھر
کوئی عورت کا دل دیکھ لے

شہرِ آذر

(پیل کاسل پر ایک شام)

انگلستان کے جزیرے "آئل آف مین" کے مغربی ساحل پر شہر پیل ہے جسے SUNSET CITY OF THE WEST کہا جاتا ہے۔ پیل کاسل پر ورڈسورتھ کی بھی ایک نظم ہے جو اس نے بیو مانٹ کی بنائی ہوئی تصویر دیکھ کر لکھی تھی اور جس طرف اس نظم میں اشارے ہیں۔ میں نے "شہرِ آذر" کے بیشتر حصے پیل کاسل کے سامنے پہاڑیوں پر لکھے ہیں

میں اس پہاڑ کی چوٹی پہ کب سے بیٹھا ہوں
پرومناڈ پہ سورج کی آخری کرنیں
اداس لہروں کی مدھم سروں میں ڈوب گئیں
فضا نے آنکھوں میں کاجل سے نقش کی تحریر
شفق نے کانوں میں سونے کی بالیاں ڈالیں
سرود و سحر و طلسمات کے جزیرے میں
نگارِ ساحلِ مغرب کہاں سنور کے چلی؟

کسی کی یاد کا بارِ گراں اٹھاتے ہوئے
عجب فسوں ہے دھندلکے میں پیل کاسل پہ
نہ سوزِ شاہدِ تنہا نہ سازِ شاہدِ بزم
نہ بیومانٹ کا خاکہ نہ ورڈسوورتھ کی نظم
بس اک خموش کہانی کی چوٹ کھاتے ہوئے
ہزاروں شاموں کی تنہا رفیق راہ گزار
لبوں میں راگ، نگاہوں میں آگ بھر کے چلی

میں ان اداس دھندلکوں میں کب سے بیٹھا ہوں
(یہاں بھی اپنی پر اسرار عادتیں نہ گئیں)
پرومناڈ پہ لوگوں نے چند لمحوں کو
نیا دیار بنایا تھا ہر دیار سے دور
خدا کی سلطنتِ جبر و اختیار سے دور
وہ اک دیار جہاں بانوئے حریمِ حجاب
چلی تو یورشِ آداب سے گزر کے چلی

چلی تو یوں کہ نہ ماضی کا غم نہ شکوۂ حال
جھکیں ادب سے سمندر کی نیلگوں آنکھیں
قدم پہ پھیل گئے ریت کے سنہرے بال
مری وفا کی طرح ایک سو نہ چاکِ جگر
مرے وطن کی طرح مضمحل نہ سوختہ حال
بس اک تبسمِ فردا کی آرزوئے وصال
کسی سے پیار کسی سے نیاز کر کے چلی

یہ ڈوبتے ہوئے سورج کے رنگ و روپ کا شہر
یہ لہر لہر پہ سورج کے آخری سائے
کہ زرد کپڑوں میں جس طرح راہبہ کوئی
گلی سے کہر میں مڑتی ہوئی نظر آئے
کہیں اک اوس کا قطرہ دھوئیں پہ جم جائے
ہر ایک لہر کی تجدیدِ شوق سے بچ کر
ہر ایک لہر کی آغوش میں نکھر کے چلی

اُتر کے اونگھتے کہرے کی نرم باہوں سے
تمہارے قرب کی دھڑکن فضا میں پھیل گئی
کہیں سے خواب کے لمحوں کو مستعار ملی
تمہارے بالوں کی خوشبو تمہارے جسم کا رنگ
تمہارے ہونٹوں کے مدھم، ملائم انگارے
پہاڑ اپنی بلندی کی بات بھول گئے
ہوا، زمین کے میزان پر اتر کے چلی

اگر کچھ اور مہکتے رہے یہ آگ کے پھول
تو ہر خلیل کا پندار ٹوٹ جائے گا
سڈول لمحوں کی آغوش اور تنگ ہوئی
تو رسمِ دل سے ہر اقرار ٹوٹ جائے گا
طلسمِ سلسلہ دار ٹوٹ جائے گا
کہ جب یہ رسم چلی ہم جگر فگاروں میں
تو حلقۂ رسن و دار سے گزر کے چلی

—— آئیل آف مین (کتاب شہر آذر سے)

فرانس

یوں نرم نگاہی سے ہوا شام کا آغاز
جس طرح کبوتر کے پرے سر سے گذر جائیں
جیسے ترے گیسو مری آنکھوں پہ بکھر جائیں

اس شام سراپردۂ اسرار سے تقدیر
مہکے ہوئے سورج میں نہاتی ہوئی نکلی
لُودَر کے در و بام سجاتی ہوئی نکلی!

اس دیس سے آیا ہے ابھی ایک مسافر
جس دیس میں اک خوابِ گراں بار ہے منزل
اک حرفِ جنوں، وحشتِ بیمار ہے منزل

اک عمر تو گذری ہے سرِ خشتِ محراب
اک شام گناہوں کی حرارت میں بھی گذرے
اے میرے بدن تیری عبادت میں بھی گذرے

ناچ اے لبِ رخسار کے جلتے ہوئے حلقے
اس لمس کے تہذیب و تمدن سے لپٹ کر
اس شاہدۂ زیست کے اقرار سے کٹ کر

گا اے ابدی راگ سے مخمور جوانی
ہر مرمر کی رگوں میں تپشِ جام اچھل جائے
پتھر کی قبا آنچ کے احساس سے جل جائے

جھوم اے دلِ دانا کہ وہ کل آ کے رہے گی
جب ہم دلِ ناداں کا علم لے کے چلیں گے
سینے میں غضب لب پہ قسم لے کے چلیں گے

زہرہ کے حسین جسم اپالو کے حسین خواب
ہم روح کے نغمے تری تکذیب کریں گے
پیدل ہیں تو رفتار پہ تادیب کریں گے

اے عقل محبت کی سزا ہے کہ نہیں ہے
اے جسم ترا پیار روا ہے کہ نہیں ہے
اے پردۂ اسرار خدا ہے کہ نہیں ہے   (پیرس)

جرمنی

میں نے کب جنگ کی وحشت کے قصیدے لکھے
میں نے کب امن کے آہنگ سے انکار کیا
میں نے تو اپنے سرِ دامنِ دل کو اب تک
کبھی پھولوں، کبھی تاروں کا گنہگار کیا
اے مری روحِ طرب میں نے ہر عالم میں
جب بھی تو آئی ترے پیار کا اقرار کیا
لیکن اس دیس کے آہنگِ گراں بار میں بھی
وہی نغمہ ہے شب تاب کی تقدیر میں ہے
میں نے زلفوں کے گھنے سائے میں سیکھی تھی جو بات
وہی اس حلقۂ بدنام کی زنجیر میں ہے
کتنے خوابوں کے طلسمات کی جنت ہے یہاں
کون سا خواب ابھی پردۂ تقدیر میں ہے

خواب اس وقت کا جو وقت نہیں آسکتا
خواب اس وقت کا جس وقت کو آنا ہو گا

گیت جس میں لب و رخسار کے افسانے ہیں
گیت جو خود بھی کبھی ایک فسانہ ہو گا!
جس کو چھیڑیں گے مہکتے ہوئے ہونٹوں کے گلاب
جس کو بندوق کے آہنگ پہ گانا ہو گا

آگ کے دشت پڑے، خون کے صحرا آئے
اب بھی لیکن وہی رفتارِ جواں ہے کہ جو تھی
میونخ اب بھی ہر اک عہد کا روشن وارث
ہائیڈلبرگ وحکمت کی دوکاں ہے کہ جو تھی۔

قرض کرتے ہیں تری مرگ وہی لوگ جنہیں
خود نہ جینے کا سلیقہ ہے نہ مرنے کا شعور!
تیرے ماتھے پہ نئے عہد نئے دن کی امنگ
تیری آنکھوں میں چمکتے ہوئے مہتاب کا نور
وینگنر کا یہ سبک ساز یہ فولاد کے گیت
تیرے سینے کی امنگیں ترے بازو کا غرور
ہم پیمبر تو نہیں ہیں ترے دیوانے ہیں
اک ذرا آگ ہمیں بھی ملے اے شعلۂ طور

(فرینکفرٹ)

ڈوور

آوف ویڈر زہن، فرالائن، آوف ویڈر زہن،

مے خانے سے میلوں جگمگ جگمگ کرتی نہر
تیرے سینے کی طغیانی، میرے دل کی لہر
ریت کی دیواروں سے بنا تھا پیار کا پہلا شہر

نگر نگر کے خواب میں گم ہیں ڈوور کے ملاح
میں ان خوابوں کے مبہم سناٹے سے آگاہ
اونچی لہریں، بڑھتا دریا، نیچی شہر پناہ

شاید اس طوفان میں ساری بنیادیں ہل جائیں
یا مشرق اور مغرب کے ساحل ایک دن مل جائیں
یہ مبہم مبہم سپنے کمہلائیں یا کھل جائیں
آوف ویڈر زہن، فرالائن، آوف ویڈر زہن!

آوف ویڈر زہن : خدا حافظ   فرالائن : آنسہ

یونان

ہم تو یہ سوچ کے آئے تھے تری گلیوں میں
کہ یہاں تیشۂ فرہاد کی قیمت ہوگی!
بھائی کیوپڈ سے ملیں گے کسی دوراہے پر
کسی بے نام سے اک موڑ پہ جنت ہوگی
ہم اولپس پہ خداؤں کی زباں بولیں گے
اپنی تقدیر میں وینس کی رفاقت ہوگی

باادب جھک کے زمیں سے یہ کہیں گے کہ حضور
آپ اب خلوتِ گمنام سے باہر نکلیں
دیر سے تشنۂ صبحِ لب و رخسار ہیں لوگ
آپ تاریکیٔ احرام سے باہر نکلیں!

پارتھنان کی مٹی سے جو مَس ہوگی نظر
ہم نے سوچا تھا کہ کھل جائیں گے سارے اسرار
آج کل یوں نہیں ہوتا ہے مگر شاید آج!
ٹوٹ جائیں گے تمدن کے مہذب پندار

اور اب شام بھی گزری کئی دن بیت گئے
ایسے دن جن میں نہ ارماں نہ گلے ہوتے ہیں
میرا سینہ شبِ مفلس کا وہ افسانہ ہے!
جس پہ ایتھنز کے خاموش دیئے روتے ہیں
ایسی پستی کہ عمارت کا گماں بھی دھوکا
جانے ہم کورِ نظر ہیں کہ خدا سوتے ہیں

(ایکراپولس)

مصر

یہ زندگی، یہ مختصر سی زندگی
اگر یونہی علالتوں کے سلسلے میں کٹ گئی
اگر یہ بانسری نہ اوس پی سکی نہ چاندنی کے نرم گھاؤ سہہ سکی
اگر عروسِ شام کی رِدا نحیف انگلیوں میں تھرتھرا کے رہ گئی
تو میں کہاں تک اپنے حوصلے کے بل پہ اپنی زخم خوردہ کائنات کو سجاؤں گا
دریدہ پیرہن میں زرد زرد پھول باندھ کر
میں سُرخ کونپلوں کی انجمن میں کیسے جاؤں گا
سحر سوئیز پر ہوئی
تو جلتی آنکھ، تپتے جسم، خشک لب کے باوجود
سوئیز اپنے ساحلوں کے درمیان ایسے بہہ رہی تھی جیسے کوئی اپنے حسن کا وقار جانتے ہوئے قدم اٹھائے
ادب سے اک قطار میں نخیل ایسے بڑھ رہے تھے جیسے کوئی بھکشوؤں کا قافلہ گپھا میں جائے
فرنگیوں کے چہرے یوں اُجڑ گئے تھے جیسے کوئی اک قدم کے فاصلے پہ موت سے نظر ملائے

انگلستان جاتے ہوئے جبرالٹر پورٹ پر شدید علالت میں لکھی گئی۔

نگارِ ارضِ نیل کے سنہرے جسم کے گداز سے لپٹ کے ایک ایک آرزو چمک گئی
نگارِ ارضِ نیل کی لٹیں کھلیں تو دور دور دور تک ہوا مہک گئی!

ہوا مہک گئی تو کیا
کہ میں ڈٹال اور اسپرٹ کا مہمان تھا
مرے تھکے ہوئے قدم
سفر کے پہلے سنگِ میل سے لپٹ کے رہ گئے
مجھے کسی ملول، دل شکستہ یاد کی طرح
سلگتے آنسوؤں کی لوریوں میں نیند آگئی
مگر حسین قاہرہ کی رات جاگتی رہی!
مہیب بُت کے عاشقوں کو موت آگئی تو کیا
مہیب بت کی عظمتِ حیات جاگتی رہی

(جبرالٹر)

کربلا

کربلا ، میں تو گنہگار ہوں لیکن وہ لوگ
جن کو حاصل ہے سعادت تری فرزندی کی
جسم سے روح سے احساس سے عاری کیوں ہیں
ان کی مسمار جبیں، ان کے شکستہ تیور !
گردشِ حسنِ شب و روز پہ بھاری کیوں ہے
تیری قبروں کے مجاور، تیرے منبر کے خطیب
فلس و دینار و توجہ کے بھکاری کیوں ہیں
روضۂ شاہِ شہیداں پہ اک انبوہِ عظیم
بل ایئر اور کرسلر کے نئے ماڈل کو !
اسی خاموش عقیدت سے تکا کرتا ہے
جس کو کہہ دوں تو کئی لوگ بُرا مانیں گے
غیر تو رمزِ غمِ کون و مکاں تک پہنچے
کربلا تیرے یہ غمخوار کہاں تک پہنچے

دل کو تہذیبِ تمنا میں خدا ملتا ہے
جنبشِ یک لبِ عیسےٰ میں خدا ملتا ہے
شورِ ناقوس و نظارا میں خدا ملتا ہے
سنگِ محرابِ کلیسا میں خدا ملتا ہے
تیرے دیوانوں کو اے شاہدِ دریائے فرات
اپنی بے مائگیٔ ذہن میں کیا ملتا ہے

(کربلا)

ویلز کی گاڑی

دن بھر کے سورج کی ہمت ٹوٹ چکی تھی
ویلز کو جانے والی گاڑی چھوٹ چکی تھی
یہ احساس تھا جیسے دل آباد نہیں ہے
جانے کون سا اسٹیشن تھا یاد نہیں ہے
یوں بے رنگ تھے جیسے دشت میں گذریں برسوں
ہم ہونے کو کیسا نودا ہوں یا کچھ ہوں

کافی دیر میں پھر سہ پہر کی گاڑی آئی
ہم نے اپنا کوٹ سنبھالا فیلٹ اٹھائی
کاریڈر میں داخل ہوتے ہی لہرائے
جسم کو جیسے بھولے سے بجلی چھو جائے
وہ سنگیت تھی یا تارا تھی یا نسرین تھی
ایسی شکل تو سارے لندن میں بھی نہیں تھی

دو گھنٹوں میں دوست بنے ہم پیار جتایا
یہ قصہ تو خیر کسی فرصت پہ اٹھایا
لیکن اتنا یاد ہے جب سورج نے جگایا
وہ بھی نہیں تھی اپنا اسٹیشن بھی نہیں تھا
جانی، پہچانی چیزیں تھیں خاموشی تھی
ویلز کی گاڑی ویلز سے واپس آ پہنچی تھی

فن کے گاہک محو ہیں تکرار میں
ہم تماشائی ہیں اس بازار میں

تیرے خد و خال سے ملتی ہوئی
شکل تھی اک روح کے معیار میں

جھلملائیں پہلے پلکوں کے اُدھر
پھر وہ شمعیں جاگ اٹھیں رخسار میں

فتح کے احساس میں گم تھا نیاز
آنسوؤں کی آنچ تھی پندار میں

سب نے اس کے حکم پر سجدے کئے
ہم اکیلے رہ گئے انکار میں

(دوم)

تری تلاش میں ہر رہنما سے باتیں کیں
خلا سے ربط بڑھایا ہوا سے باتیں کیں

کبھی ستاروں نے بھیجا ہمیں کوئی پیغام
تو مدتوں میں کسی آشنا سے باتیں کیں

ہماری خیر مناؤ کہ آج خود اس نے
بڑے خلوص، بڑی التجا سے باتیں کیں

گناہ گار تو رمزِ حریم تک پہنچے
ثواب والوں نے بانگِ درا سے باتیں کیں

بہت سے وہ تھے جنہوں نے بتوں سے فیض اٹھائے
بہت سے وہ تھے جنہوں نے خدا سے باتیں کیں

نہ جانے کب سے سناتے تھے اس کو ہم احوال
نظر اٹھائی تو پھر ابتدا سے باتیں کیں

ہزار شعر کہے یوں تو کہنے والوں نے
کسی کسی نے دلِ مبتلا سے باتیں کیں

قدم قدم پہ تمنائے التفات تو دیکھ
زوالِ عشق میں سوداگروں کا ہات تو دیکھ

بس ایک ہم تھے جو تھوڑا سا سر اٹھا کے چلے
اسی روش پہ رقیبوں کے واقعات تو دیکھ

غمِ حیات میں حاضر ہوں لیکن ایک ذرا
نگارِ شہر سے میرے تعلقات تو دیکھ

خود اپنی آنچ میں جلتا ہے چاندنی کا بدن
کسی کے نرم خنک گیسوؤں کی رات تو دیکھ

عطا کیا دلِ مضطر تو سی دیئے میرے ہونٹ
خدائے کون و مکاں کے توہمات تو دیکھ

گناہ میں کبھی بڑے معرفت کے موقعے ہیں
کبھی کبھی اسے بے خدشہ نجات تو دیکھ

غازی بنے رہے سبھی عالی بیان لوگ
پہنچے سرِ صلیب فقط بے نشان لوگ

اخلاقیاتِ عشق میں شامل ہے یہ نیاز
ہم ورنہ عادتاً ہیں بڑے خود گمان لوگ

چھوٹی سی اک شراب کی دوکان کی طرف
گھر سے چلے ہیں سن کے عشاء کی اذان لوگ

دل اک دیارِ رونق و رم ہے لٹا ہوا
گذرے ہیں اس طرف سے کئی مہربان لوگ

اے دلِ انہی کے طرزِ تکلم سے ہوشیار
اس شہر میں ملیں گے کئی بے زبان لوگ

آیا تھا کوئی شام سے واپس نہیں گیا
مڑ مڑ کے دیکھتے ہیں ہمارا مکان لوگ

ان سے جنہیں کنوئیں کے سوا کچھ خبر نہیں
مغرب کا طنز سنتے ہیں ہم نوجوان لوگ

یوں تو وہ ہر کسی سے ملتی ہے
ہم سے اپنی خوشی سے ملتی ہے
سیج مہکی بدن سے شرما کر
یہ ادا بھی اسی سے ملتی ہے
وہ ابھی پھول سے نہیں ملتی
جوہیئے کی کلی سے ملتی ہے
دن کو یہ رکھ رکھاؤ والی شکل
شب کو دیوانگی سے ملتی ہے
آج کل آپ کی خبر ہم کو!
غیر کی دوستی سے ملتی ہے
شیخ صاحب کو روز کی روٹی
رات بھر کی بدی سے ملتی ہے
آگے آگے جنون بھی ہو گا!
شعر میں تو ابھی سے ملتی ہے

یہ گھٹا گھٹا طوفان، یہ تھمی تھمی بارش رُوبرُو نہ رہ جائے
آج اس طرح رو لے جس کے بعد رونے کی آرزو نہ رہ جائے
دوستو گلے مل لو، ساتھیوں کی محفل میں دو گھڑی کو مل بیٹھو
اس خلوص کی شاید میرے بعد دنیا میں آبرو نہ رہ جائے
صبح و شام کی الجھن، رات دن کے ہنگامے روز روز کا جھگڑا
دیکھ پیرِ میخانہ آج میں نہ رہ جاؤں یا سبو نہ رہ جائے
اپنا غم نہ اس کا غم ڈوبتی ہوئی لَو کو فکر ہے تو اس کی ہے
دربدر نہ رسوا ہو حسرتوں کا افسانہ کو بہ کو نہ رہ جائے

(لندن ۸۲)

فضائے شامِ غریباں طلوعِ صبحِ طرب
مری سرشت میں کیا کچھ نہیں بہم آمیز

شکستِ دل کے فسانے کا ایک باب ہے اشک
لہو نے جس میں کیا ہے ذرا سا نم آمیز

مجھے تو اپنی تباہی کا کوئی علم نہ تھا
مگر وہ آنکھ بھی ہے آج کل کرم آمیز

کبھی جنونِ تمنا کبھی بے غرض بے لوث
کبھی خلوصِ رفاقت کبھی بیش و کم آمیز

مرے صنم میں بہت کچھ خدا کے تیور ہیں
یہ اور بات کہ تیرا خدا صنم آمیز

زندگی دھوپ ہے سناٹا ہے
نکہتِ عارض و کاکل والو!

رات آئے گی گزر جائے گی
عاشقو! صبر و تحمل والو!

ہم میں اور تم میں کوئی بات نہ تھی
مہ جبینوں میں تجاہل والو

اعتبارات کبھی اٹھ جائیں گے
اے غمِ دل کے تسلسل والو!

پھر بہاروں میں وہ آئیں کہ نہ آئیں
دوستو! زخمِ جگر دھلوا لو

آؤ کسی اداس ستارے کے پاس جائیں
دریائے آسماں کے شکارے کے پار جائیں
اس سے کبھی پوچھ لیں کہ گذرتی ہے کس طرح
یارو کبھی کسی کے سہارے کے پار جائیں
مٹھی میں لے کے دل میں بٹھا لیں جو ہو سکے
اک ناچتی کرن کے شرارے کے پاس جائیں
اس مہ جبیں کی یاد بھی باقی نہیں رہی
کس منہ سے چاندنی کے نظارے کے بن جائیں
ناپختگانِ عشق عجب وسوسے میں ہیں
دیکھیں یہیں کہیں سے کہ دھارے کے بن جائیں
اس کش مکش میں سارے ادیبوں کا ذہن ہے
دل کی طرف چلیں کہ ادارے کے پاس جائیں
یا جا کے چھپ رہیں کسی شیشے کے قصر میں
یا عصرِ انقلاب کے آرے کے پاس جائیں !

تمہیں کیا فکر کیا اندیشۂ جاں ہم جو بیٹھے ہیں !
کہاں جائیں گے دنیا بھر کے طوفاں ہم جو بیٹھے ہیں
سحر کے قافلو تم اپنی اپنی راہ پر جاؤ
یہیں رہ جائے گی شامِ غریباں ہم جو بیٹھے ہیں !
دکانِ شاعری میں اک سے اک رمزِ نہاں لیکر
بکے گا اس کا دیں اور اس کا ایماں ہم جو بیٹھے ہیں
گنہگارو عروجِ زُہد سے ناشادمت ہونا !
بڑھے گا کاروبارِ جنسِ عصیاں ہم جو بیٹھے ہیں
کسے اس کی نگاہِ ناز اب کے منتخب کر لے
بہت مصروف ہیں یارانِ یاراں ہم جو بیٹھے ہیں
میاں ہم سے سبق لو مصطفیٰ زیدی پہ مت جاؤ
تمہارے میکدے کے میرِ رنداں ہم جو بیٹھے ہیں

سحر جیتے گی یا شامِ غریباں دیکھتے رہنا
یہ سر جھکتے ہیں یا دیوارِ زنداں دیکھتے رہنا

ہر اک اہلِ لہو نے بازیٔ ایماں لگا دی ہے
جو اب کی بار ہوگا وہ چراغاں دیکھتے رہنا

ادھر سے مدعی گزریں گے ایقانِ شریعت کے
نظر آجائے شائد کوئی انساں دیکھتے رہنا

اُسے تم لوگ کیا سمجھو گے جیسا ہم سمجھتے ہیں!
مگر پھر بھی کریں گے اس سے پیماں دیکھتے رہنا

سمجھ میں آ گیا نیرنگ نگاہوں کے الجھنے پر!
بھری محفل میں سب کا ہم کو حیراں دیکھتے رہنا

ہزاروں مہرباں اس راستے پر ساتھ آئیں گے
میاں یہ دل ہے یہ جیب و گریباں دیکھتے رہنا

دبا رکھو یہ لہریں ایک دن آہستہ آہستہ
یہی بن جائیں گی تمہیدِ طوفاں دیکھتے رہنا

○

بہت بڑھنے لگے تھے دعویٰ دیر و حرم لوگو
غنیمت ہیں ہمارے شہر میں اس کے قدم لوگو!

کبھی دیکھا ہے اس صورت کا کوئی آدمی تم نے
بزرگو، ناصحو، عالی مقامو، محترم لوگو!

جسے کل تک حیا سے بات کرنا بھی نہ آتا تھا
ذرا ہم بھی تو دیکھیں اس کا اندازِ ستم لوگو!

گذرنے کو تو ہم پر تم سے نازک وقت گذرے ہیں
نہ اپنی شکل آزردہ، نہ اپنی آنکھ نم لوگو!

خلوصِ دوستداری نے ہمیں جو دن دکھائے ہیں
ہمیں ان کا خیال آتا ہے لیکن تم سے کم لوگو!

تمہاری انجمن میں بن گیا ہر منہ کا افسانہ
وہ اس کا خود سے شرماتا ہوا لطف و کرم لوگو

بہ قدرِ ظرف سب نے پیار کی قیمت لگائی ہے
کبھی آنسو، کبھی نغمہ، کبھی دام و درم لوگو

○

ہم سے پہلے کبھی یہ مرتبہ دار نہ تھا
عشق رُسوا تھا مگر یوں سرِ بازار نہ تھا

آج تو خیر ستارے بھی ہیں ویرانے بھی
ہم پہ وہ رات بھی گذری ہے کہ غمخوار نہ تھا

کیا مری بات کو سمجھے کہ ابھی وہ کل تک
راہ و رسمِ دلِ ناداں سے خبردار نہ تھا

(رن ہٹ)

آگ لینے کے واسطے ہم سے
کوہِ طور آ کے ایک بار مِلا
تم کو دیکھا تو یہ ہوُا محسوس
جیسے اک حادثے کا تار مِلا
دیکھے لاکھوں کسوٹیوں پہ نشان
تب کہیں جا کے اک سنار مِلا
ہم کو اس سے ملی رفاقت بھی
کم نصیبوں کو صرف پیار مِلا
لحظہ لحظہ بدلتی دنیا میں
ہم کو ہر نقش پائدار مِلا
دل وہ منعم ہے جس کو بن مانگے
ساری دنیا کا کاروبار مِلا
جو دیا تھا امیدِ منزلِ شب
شام ہی سے جگر فگار مِلا

کوئی رفیق بہم ہی نہ ہو تو کیا کیجے
کبھی کبھی ترا غم ہی نہ ہو تو کیا کیجے

ہماری راہ جُدا ہے کہ ایسی راہوں پر
رواجِ نقشِ قدم ہی نہ ہو تو کیا کیجے

ہمیں بھی بادہ گساری سے عار تھی لیکن!
شراب ظرف سے کم ہی نہ ہو تو کیا کیجے

تباہ ہونے کا ارمان سہی محبت میں
کسی کو خوئے ستم ہی نہ ہو تو کیا کیجے

ہمارے شعر میں زوبیؔ کا ذکر بھی ہو گا
کسی کسی کے شکم ہی نہ ہو تو کیا کیجے

(دالکبانو لندن)

زیدی جی پھر عشق کو نکلے اپنا ہے یہ پاپ
اِک بیوی کے شوہر میاں اور اک بچے کے باپ

اسکی موہن شکل کو دیکھ کے ٹھان لیا بن باس
یوپی کے اِک سیّد زادے بن گئے تلسی داس

اپنے دل کی اوس میں جل کر آدھی رات کو سوئی
اک بد صُورت لڑکی جس کی بات نہ پوچھے کوئی

اک لڑکی جس سے کوئی برسوں بات نہ کرنے آئے
اپنی ہجولی کے چھبیلے بالم پر غُرّائے

اک تو نیل گگن کی رانی سُرخ کنول کے بیچ
دُوجی اک برسات کا نالا جس میں کیچ ہی کیچ

صرف کہہ دوں کہ ناؤ ڈوب گئی
یا بتاؤں کہ کیسے ڈوبی تھی
تم کہانی تو خیر سن لوگی
آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی

—

کوئی ساغر میں دیکھتا ہے فرار
کوئی جسموں میں ڈھونڈتا ہے سکوں
مجھ کو بھی مل گئی ہے جائے پناہ
شعر لکھتا ہوں اور جیتا ہوں

—

کیا خبر آج تیری آنکھوں میں
بڑھی ہے کہ غم سے راز و نیاز
میرے سینے سے اب بھی آتی ہے
تیری پلکوں کی رحمِ دل آواز

—

وقت کے ساتھ لوگ کہتے تھے
زخمِ دل بھی تمہارے ہوں گے دور
آج کوئی انہیں خبر کر دو
میرا ہر زخم بن گیا ناسور

—

میری آنکھوں میں نیند چبھتی ہے
میرے سینے میں جاگتے ہیں الاؤ
دیوتاؤ مری کہانی کو !
تم سمجھ لو تو آدمی بن جاؤ

—

مجھ کو چپ چاپ اس طرح مت دیکھ
میرے بستر کی سلوٹیں مت کھول
رات میں کتنی دیر سویا ہوں!
بول اے صبح کے ستارے بول

—

اس کے چہرے کا عکس پڑتا ہے
اس کی باتیں شروع ہوتی ہیں
آج کل رات بھر مرے دل میں
کتنی صبحیں طلوع ہوتی ہیں

—

کاش ہم لوگ لڑ گئے ہوتے
آپ کی دوستی کا رونا ہے
دل سے گردِ الم نہیں چھٹتی
آنسوؤں کی کمی کا رونا ہے

—

مدتوں کور نگاہی دل کی
نورِ عرفان کو ترستی رہتی
تو جو خورشید نہ بن کر آتی
ذہن پر اوس برستی رہتی!

—

مثنوی سیاستِ درباں

یعنی مثنوی بنام ساحرانِ بیان المعروف بہ مثنوی زیرکی و دیوانگی

نزول :-

ایک شعلے کو طور لکھتے تھے — آدمی ہو تو حور لکھتے تھے
شعر پرداز ہر زمانے کے — مثنوی بھی ضرور لکھتے تھے

پہلے عقبیٰ کی بات ہوتی تھی — حمد ہوتی تھی نعت ہوتی تھی
مُرغِ سدرہ کا بال ہوتا تھا — حال ہوتا تھا، قال ہوتا تھا
اور پھر داستانِ ہوش رُبا — دشتِ غربت، کجاوۂ لیلیٰ
داستانِ عجائبِ ایران — دیو و اژدر، فرشتہ و انسان
مدتوں شاہِ سلطنت کا شکیب — آئے ذن کی مراد، دل کے فریب
جشنِ میلاد پر چھنک پازیب — بارہویں سال میں کوئی آسیب
دینا ترجیح نصف کو کل پر — شیر کا کسب کو توکل پر!
ایک عبرت پسند افسانہ — کسی تاجر اور اسکی طوطی کا

دعوئے ہُدہُد کا، زاغ کا اعلان — عالمِ نحو اور کشتی بان
حادثہ اک نہنگِ دریا کا — واقعہ بیژن و منیژہ کا

حمد :-

پہلے ہوتی ہیں حمد کی باتیں — ہم مگر کس کی حمد میں لکھیں؟
وہ کسی کا کہا نہیں سنتا! — مولوی کی دعا نہیں سنتا
ہم تو عاصی ہیں ہم تو گندے ہیں — ان کو دیکھو جو اس کے بندے ہیں
اسکی خلقت میں جس قدر ہیں نام — کس کو حاصل ہے آجکل الہام؟
اس لئے بہرِ یک سلام و پیام — آؤ ڈھونڈیں اساتذہ کا کلام
میر صاحب کے باغ میں گھومیں — میرزا کی بیاض کو چومیں
یا ابھی اتنی دور تک کیوں جائیں — کیوں نہ دستِ صبا سے کام چلائیں

نعت :-

اے صبا اے رفیقِ میر و حسن — ناشرِ واقعاتِ صحنِ چمن!
حاملِ نکہتِ لب و رخسار — قاصدِ حادثاتِ فصلِ بہار
پیکِ افسانہ ہائے مصر و عراق — غم گسارِ مریضِ شامِ فراق
اے کہ شاطگی ہے تیرا اصول — اے شبستانِ ماورا کی رسول
اے کہ تجھ سے کوئی نہیں پنہاں — واقفِ رازِ خلوتِ انساں

لوگ رکھتے ہیں اس زمانے کے — دانت کھانے کے اور دکھانے کے
عقل کی رہنمائی سے بدظن — جہل کے دوست علم کے دشمن
دل کے کالے زبان کے کچے! — سازشوں کے جنے ہوئے بچے
لے کے چلتا ہے وقت کا دھارا — ان کی فرمائشوں کا پشتارا
ان کے دشمن کو مار پہ لکھئے — یہ نہیں تو بہار پہ لکھئے
صاحبانِ کلاہ اچھے تھے — ان سے تو بادشاہ اچھے تھے
طیش میں حکمِ قتل بھرتے تھے — طعن و تشنیع تو نہ کرتے تھے
آج ہیں مثلِ سر بہ مہر گلاس — سب خواص اور سب عوام الناس
عقل کی پوچھئے نہ جیتے سے — یہ چھلکنے لگیں گے غصے سے
ان کی مرضی ہے جو کریں تلقین — دین کو کفر اور کفر کو دین
رجعتِ غم پسند بھی گالی — اور ترقی پسند بھی گالی!
اس کے درباں ہیں سوکھُد کتے ہیں — فن کی تہذیب سے بدکتے ہیں
جان دے یا عظیم کہلائے — آدمی جائے تو کہاں جائے

رَجَز :-

حسنِ ظن تو نہیں اگر یہ کہوں — میں بھی تھوڑا شعور رکھتا ہوں
خصلتاً چپ ہے تیرا جذباتی — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

میری نظموں کا ہے ہر اک انداز — میرے پورے وجود کی آواز
اک خلا کی صدا نہیں ہوں میں — ہڈیاں بھی ہیں پھیپھڑے بھی ہیں
دل پہ خوں ہے میری اِک اِک رگ — شاعرانہ مبالغوں سے الگ
میرے لہجے میں ڈھونڈتی ہے وقار — اقتصادی خیال کی رفتار
میری باتوں میں احتساب بھی ہے — میری نظموں میں انقلاب بھی ہے

رجعت پسندی

ہاں مگر سوچتا ہوں میں اکثر — کیا یہ ہے آخری مقامِ نظر!
یہ پُراسرار تشنگی کیا ہے — فرد کیا شے ہے زندگی کیا ہے
وہ سفر کے خیال کے مجنوں — میں تو مقصد کی بات کرتا ہوں
اور مرے اس سوال میں خود بیں — سارتر اور کیرکیگارڈ نہیں
یہ مرے تجربوں نے پوچھا ہے — آدمی کی حدوں نے پوچھا ہے
اپنے احساس سے پناہ نہیں — کافکا کا کوئی گناہ نہیں!
ذہن میں آگ ایسے سوتی ہے — جیسے روٹی کی بھوک ہوتی ہے
حدتِ مہرِ تابدار ہے ذہن — ایک میدانِ کارزار ہے ذہن
دل کی سب سے بڑی دلیل ہے ذہن — ابدیت کا سنگِ میل ہے ذہن
ذہن میں خواب بیج بوتے ہیں — ذہن کے اپنے شہر ہوتے ہیں

ذہن کو ہے خدا کی سی توفیق — ذہن کرتا ہے انجمن تخلیق

در ہجوِ عطّار :-

اے صبا ان سے یہ بھی کہنا ہے — دِل کے مکھڑے پہ ذہن گہنا ہے
تولتے ہیں جسے یہ اہلِ نظر — ادرک اور پھٹکری کے کانٹے پر
اک طرف ضبط اک طرف جلدی — اک طرف شعر اک طرف ہلدی
عقل سوداگروں کی ہلچل میں — فکر ماء اللحم کی بوتل میں
ماہرِ نفسیات و اہلِ نظر — ہینگ ملتے ہیں اب کسوٹی پر
آنسوؤں سے عرق بناتے ہیں — دھوپ دے کر حنا جلاتے ہیں
پرِ پرواز سایۂ وکابوس — پھول کا نام جیّد الکیموس
دل میں اک پون انچ کی بتّی — فن پہ یک وزن ماشہ و رتی!
شاعروں سے شکایتیں بانیں! — ایسا لکھیے کہ ہم بھی کچھ سمجھیں
نامۂ شوق کا جواب آئے — شعر سے بوئے بید آب آئے
بار گزرے نہ درسِ مکتب پر — نظم ہو لخلخے کے مذہب پر

منشور :-

یوں تو ہر فلسفہ عبادت ہے — یوں تو مذہب بھی اک محبت ہے
ہاں مگر ان کے میرے مذہب میں — تفرقے کی ہیں سینکڑوں باتیں

جب کبھی ان کی ھار ہوتی ہے
زندگی صبر پہ بار ہوتی ہے

ایک لمحے میں پھینکتا ہے خون
ان کے پورے وجود کا قانون

گھورتی ہیں پھٹی پھٹی آنکھیں
اپنے احساس کی اکائی میں

اور کچھ بھی نظر نہیں آتا
ایک ٹوٹی ہوئی کمان کے سوا

میرا مذہب خود اپنا مذہب ہے
عشق ہے کائنات ہے سب ہے

یہ نہیں ہے کہ اس کی دنیا سے
غم کے بادل کبھی نہیں گزرے

زیست میلہ نہیں ہے ہنستوں کا
تجربہ ہے اسے شکستوں کا

بارہا میرے اپنے سینے میں
کٹ چکی ہیں ہزار ہا گرہیں

غم کہ ہے اک خیال اک افسوں
میں اسے انگلیوں سے چھوتا ہوں

یہی نشتر جو کاٹ دے رگ و پے
میری نس نس میں ہوتا آیا ہے

میں نے لیکن لہو کے دامن میں
ڈال دی ہیں خیال کی کرنیں

رات لے کر سحر سجائی ہے
زخم پر ہنس کے جیت پائی ہے

چھین کر آنسوؤں سے موت کی آگ
ہر تبسم کو دے دیا ہے سہاگ

دل گنوایا ہے تیر کھایا ہے
عشق کو جاوداں بنایا ہے

ایک منزل شعور اور وجدان
ذہن اور دل کی ایک ہی میزان

اور یہ صاحبانِ سوزِ دروں
عشق کو دل میں مانتے ہیں جنوں

اور ایسا جنوں کہ جس کا مکان
یا کتابیں ہیں یا فقط ہذیان

عشق ہے ان کی ایک رسمی لَے
اور اپنا تو سارا نغمہ ہے

نام ہے اپنا سب حوالوں میں
بات کی لاج رکھنے والوں میں

زخم تلووں میں چند رکھتے ہیں
ہم مگر سر بلند رکھتے ہیں

دل ڈراتی ہے کھینچتی ہے کمان
دو گھڑی کی سیاستِ درباں

ہم کو لیکن لگن کبھی آتی ہے
یار کی انجمن کبھی آتی ہے

ہر زمانے میں ہم پہ حرف آئے
ہم نہ اپنے کیے پہ پچھتائے

اہلِ دنیا تو ایک ہوتے ہیں
لوگ بے چارے نیک ہوتے ہیں

حرف رکھنا انہی کو بھاتا ہے
ہم کو غصے پہ پیار آتا ہے

جس جگہ یہ کنول جلاتے ہیں
ہم وہاں کونپلیں اگاتے ہیں

ان کو بھاتی ہیں سنگ کی لہریں
اپنے تیشے کو دودھ کی نہریں

راستے سخت منزلیں بے نام!
دل نہیں ہارتے جنوں کے امام

زیست سہہ لے گی رات کا ہر وار
جگمگا دیں گے چاند سے رخسار

آنچ پڑتی رہے گی ہر فن پر!
تاب آتی رہے گی کندن پر

خوں پیے گی زمینِ گلشن کی!
ساکھ بڑھتی رہے گی ساون کی

جشنِ بادِ صبا نہیں رُکتا

پھول کا قافلہ نہیں رُکتا

جب کبھی پھول سوکھ جاتے ہیں

اور آتے ہیں ..... اور آتے ہیں

